جہاد اور جنگ......سیرت حسینی کے آئینے میں

صدر العلماء آیۃ اللہ سید باقر نقوی صاحب قبلہ لکھنوی مدظلہ، دبئی

اللہ جانے کاروان حیات بشر کہاں سے چلا ہے اور کس سمت کو راہ سپار ہے؟ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے اور ہر آن ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں سال قبل نوعِ انسانی کے وہ گروہ جو ریگستانوں، صحراؤں، جنگلوں، کوہساروں، پہاڑوں اور غاروں میں زندگی گزارا کرتے تھے آہستہ آہستہ چیونٹی ہی کی چال سے سہی، مہذّب، متمدن اور ترقی یافتہ ہوتے گئے۔ پہلے چھوٹی چھوٹی بستیاں بسائیں جو بڑھتے بڑھتے گاؤں اور قریہ کی شکل میں بدلتی گئیں۔ یہ قریے قومی سرداروں اور طاقتور سربراہوں کی قوت اور طاقت کے سہارے آس پاس کے کھیتوں، گردونواح کی چراگاہوں اور اطراف وجوانب کی شکارگاہوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور جنگ وجدال، خون خرابہ کرکے ان پر قابض ہوجایا کرتے تھے جس قریہ نے طاقت کے بل بوتے پر اپنی پڑوسی بستی کو زیر کرلیا اس کی آبادی، قوت اور ثروت بڑھ گئی۔ اسی طرح شہروں کا وجود منصۂ شہود میں آیا۔ یہ انسان مل جل کر رہنے کا عادی اور مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اشتراکِ عمل اور تعاون کے بغیر زندہ رہنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ جب چند گھرانے یکجا آباد ہوئے تو صنعت وحرفت نے جنم لیا اور مصنوعات کو خریدار تک پہنچانے اور ایک جگہ کی پیداوار کو دوسری جگہ لے جانے کے لئے کاروبار اور بیوپار کی زندگی کا آغاز ہوا۔

آدم زاد اپنی پیدائش کے وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اس کے بعد سب سے پہلے اس کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ پھر اپنے خاندان، اعزا و اقربا سے آشنا ہوتا ہے۔ آگے چل کر شہر کے رہنے والوں اور آس پاس کے بسنے والوں سے متعارف اور روشناس ہوتا ہے۔ عمر بڑھتی ہے شعور ترقی پاتا ہے تو ملک کے جھگڑوں بکھیڑوں میں حصہ لینے لگتا ہے۔ علم اخلاق کی اصطلاح میں افراد کی اسی جدوجہد اور کوشش کو جو وہ اپنی ذات کی اصلاح کے لئے کرتے ہیں تہذیب نفس کہا جاتا ہے۔ اپنے خاندان اور گھریلو زندگی کے لئے جو اصلاحی اقدامات کئے جاتے ہیں ان کو تدبیر منزل کا نام دیا جاتا ہے۔ سوسائٹی اور سماج کے مفاد کی خاطر جو خدمات انجام دی جاتی ہیں ان کو حسن معاشرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ملک وقوم، ریاست ومملکت کے لئے دوڑ دھوپ کو سیاست مدن کے مشہور نام سے پکارا جاتا ہے اور جب یہ افراد مختلف اقوام وملل کے حالات اور معاملاتِ نوعِ انسانی سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی سعی وکوشش کو تعلقات بین الملی کا نام دیا جاتا ہے۔ سیاست فاضلہ کا سیدھا اور صحیح گُر تو یہی ہے کہ خداوند عالم خالق کائنات بھی ہے اور مختارِ کل اور اقتدارِ اعلیٰ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اسی نے ہم سب کو پیدا

کیا اور پیدا کر کے مطلق العنان چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہماری رہبری اور راہ نمائی کے لئے آئین وقوانین بھی بنا کر بھیج دیئے ہیں۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کی ملکیت ہے۔ ہم کو اس نے طاقت وقوت مرحمت فرمائی ہے اس کی بدولت ہم دولت کماتے اور مالدار بن جاتے ہیں۔ اس مال ودولت کے مالک نہیں بلکہ امین کی حیثیت سے اس کے معین کردہ قوانین کے مطابق صرف کر سکتے ہیں۔ انسان نے اس فطری اصول کو نظرانداز کر کے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ اللہ کی مملوکہ زمین میں اس کا امین اور نائب بننے کے بجائے خود ایک باغی اور مستقل حکمراں بن گیا اور ہر کام میں من مانی شروع کر دی۔

شروع شروع میں تو سب لوگ برابر سمجھے جاتے تھے پھر مالدار اور نادار، کالے گورے کا فرق پیدا ہوا۔ ہوشیار اور چالاک لوگوں نے کمزوروں کو دبانا شروع کیا۔ مال ودولت، قہر وغلبہ اور دھوکا دھڑی کے بل بوتے، اپنی قیادت، امارت، حکومت اور شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اور سادہ لوح بنی آدم کو دھوکے میں رکھنے کے لئے جھوٹے فلسفے اور سیاست نامے مرتب کئے۔ وادی دریائے نیل، فرات ودجلہ کا دوآبہ، ایران اور توران کے میدان، سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے سیراب ہونے والی زمینیں، گنگا اور جمنا کے سرسبز وشادات کنارے اور ہانگو اور یانگ سی کیانگ کے زرخیز ساحل غرض جہاں جہاں تمدن بشری نے جنم لیا اور ثقافت وتہذیب نے برگ وبار پیدا کئے، وہاں یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ جو بھی طاقت وقوت کے زور پر حکمراں بن جاتا ہے اس کے منھ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون ہوتی ہے اور اس کا ہر عمل حق کا معیار اور ہر فعل قابل ستائش ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بولے تو اس کو سچ سمجھو، وہ دن کو رات اور رات کو دن، تاریکی کو اجالا اور اجالے کو تاریکی بتائے تو اس کی تائید کرو۔ قانون فطرت میں خونریزی بُری چیز ہے۔ ناحق انسان کو موت کا نوالا بنالینا گناہ ہے لیکن جب فرماں روائے مملکت خون بہاتا ہے اور ایک دو نہیں، ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے تو اس کا یہ کام پاپ نہیں پُن۔ برائی نہیں اچھائی سے بدل جاتا ہے۔ عہد قدیم کے میدانِ سیاست کے قائدین بادشاہ کو راعی اور ملک کے باشندوں کو رعایا کے نام سے پکارتے تھے آج بھی اسی دستور پر عمل درآمد ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی بھیڑوں کے گلّے کو جو چرواہے سے نسبت ہے وہی نسبت ملک کے رہنے والوں کو وہاں کے بادشاہ سے ہے جس طرح چرواہا، بھیڑوں کا اون کاٹتا، ان کا دودھ پیتا اور ضرورت پڑنے پر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھا جاتا ہے اسی طرح بادشاہ اپنی رعایا کے جسم وجان اور دین وایمان کا مالک ہے اور جب مالک ہے تو اس سے باز پُرس کیسی، عدل وانصاف اور رحم وکرم کا کیا سوال؟ جب وقت وبخت کا ہُما کسی کے سر پر سایہ افگن ہو کر اس کو چتر شاہی اور تخت حکمرانی کا مالک بنا دیتا تھا تو اس کی ہر نقل وحرکت سند اور ہر قول وعمل قابل تقلید ہو جاتا تھا۔ وہ قانون کا سرچشمہ، اختیار واقتدار کا منبع اور حق وانصاف کا معدن بن جاتا تھا۔ اس کے دربار میں بولی جانے والی زبان ٹکسالی اور اس کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ فصیح سمجھا جاتا تھا۔ ہزاروں سال سے سیاست کی بنیاد مکاری اور فریب پر ہے لہٰذا وہی

شاطر بساط سیاست پر کامیاب رہتا ہے جو سب سے زیادہ دھوکا دے سکتا ہو۔ کیا آپ کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی کہ عرب امیر شام کی سیاست کا لوہا مانتے اور حضرت علیؑ کی ملکی مصلحتوں اور دینی بصیرتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ آخر حضرت کو اظہار فرمانا پڑا: ''وَاللّٰهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِاَدْهَیٰ مِنِّیْ وَلٰكِنَّهٗ يَفْجُرُ يَغْدِرُ وَلَوْ لاَ كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ اَدْهَیٰ النَّاسِ۔''

ربع مسکون پر نسلِ انسانی کی تگ ودو، جدّوجہد اور نقل وحرکت کا بیان تاریخ کہلاتا ہے اور اس کا سرسری مطالعہ کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ ابوالبشر سے لے کر اس وقت تک یہاں خیروشر، نوروظلمت اور عدل وظلم میں مسلسل کشمکش رہی ہے۔ خداوندعالم خیروبرکت کا سرچشمہ ہے، اس کے نائب خیر کو پھیلانے، اندھیرے کو اُجالے سے بدلنے اور ظلم واستبداد کو مٹا کر عدل وانصاف قائم کرنے کی جدوجہد میں ہمیشہ مشغول رہے مگر شر پسند اور فتنہ وفساد کی خوگر قوتیں ان کے سامنے صف آرا ہوتی اور نت نئے حربوں سے خیر کو پھیلنے سے روکتی رہیں۔ اس کرۂ خاکی پر کیا منحصر پوری کائنات میں منفی اور مثبت عنصروں کی کارفرمائی ہے۔ سارا نظامِ حیات مجموعۂ اضداد ہے۔ ایٹم کے اندر منفی اور مثبت ذرّات کی تگ ودو ہی بزم وجود کی آرائش وزیبائش کا سبب بنتی ہے اور نفس انسانی میں جذبات متقابلہ کی کشمکش اور داروگیر ہی آدمی کو مطلق حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔

یہ عجائب خانۂ فطرت جس میں انسان اشرف المخلوقات بنا بیٹھا ہے اضداد کا جلوہ خانہ ہے۔ یہاں چیزیں اپنی ضد کے بغیر پہچانی ہی نہیں جاسکتی ہیں۔ ''تعرف الاشیاء باضدادھا'' اندھیرا نہ ہوتو اجالے کی قدر کیسے ہو، تلخی کے بغیر شیرینی کا کیا لطف، جو دُکھ سے دوچار نہ ہوا وہ سُکھ کو کیا سمجھے؟ جب تک کائنات میں زندگی، شعور وادراک کے ساتھ موجود ہے حق وناحق، خیروشر اور نوروظلمت کی کشمکش بھی باقی رہے گی۔ کائنات میں چہل پہل اور دھوم دھام اسی کشمکش کی وجہ سے ہے اور حیات انسانی کا کارواں اسی تنازع للبقا کی بدولت رواں دواں نظر آتا ہے۔ راستہ میں بہت سے موڑ ایسے آتے ہیں جب اس کارواں کے قدم ڈگمگانے لگتے اور گھات میں لگے ہوئے رجعت پسند ڈاکو اور ظلمت خیز قزاق اس قافلہ پر چھاپہ مارنے پر تل جاتے ہیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند قوتیں میدان میں نمودار ہوکر کاروان کو تباہی سے بچالیتی ہیں۔

۶۰ھ میں بھی یزید نے اپنے اعوان وانصار سمیت نسل بشری کی ترقی کی راہ روکنی چاہی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزادیِ فکروبیان اور حریت عمل وایقان کی جو شمعیں جلائی تھیں۔ عدل ومساوات کی جس شاہراہ پر نسل انسانی کو ڈال دیا تھا۔ یزید اس سے بنی آدم کو محروم کرنا چاہتا تھا۔ امام حسینؑ نے جو وارث رسالت مآبؐ ہونے کے ساتھ ساتھ وارثِ آدمؑ بھی تھے۔ آگے بڑھ کر اس کو للکارا اور اپنی حکمت عملی سے تمدن، تہذیب، ثقافت اور ترقی کے عمل کو تیز کردیا۔ یزید اپنے آپ کو داعی انقلاب، مصلحِ اخلاق، پیغمبر عدل وانصاف کا جانشین کہتا تھا اور ان کا نام لے کر تاریخ کے عمل اصلاح کا رُخ موڑنا چاہتا تھا، امام حسینؑ نے

اسے بے نقاب کر دیا اور مختصر سے گروہ کو ساتھ لے کر اس کی طاغوتی اور سامراجی طاقتوں کا اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ سارے معاشرے کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ ہم ہر سال کربلا کی تاریخی جنگ کی یادگار مناتے ہیں۔ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں جہاں جہاں ظالم دشمن اور مظلوم دوست قومیں بستی ہیں وہاں یہ داستان غم بار بار دہرائی جاتی ہے اور حقوق انسانی کی طلبگار ہستیاں اس مختصر گروہ کی شجاعت، ہمت اور بے جگری کا ذکر سن کر عش عش کرتی ہیں جس نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل استبداد اور انسانیت سوز اقتدار کے خلاف مؤثر آواز بلند کی تھی۔ یہ بیسویں صدی ہے اور دنیا ایک دو نہیں بیسیوں ایسی جنگیں دیکھ چکی ہے جس میں لکھوکھا آدمیوں نے صف آرائی کی تھی اور نتیجہ میں شہر ہی نہیں بلکہ ملک کے ملک تباہ ہو گئے کربلا کی جنگ اس وجہ سے یادگار زمانہ نہیں ہے کہ اس میں اتنی فوجیں جمع ہوئی تھیں جتنی کسی جنگ میں جمع نہ ہو سکی تھیں یا ایسے اسلحہ استعمال ہوئے جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی یا جنگ کربلا بے نظیر ہے اور ضرور بے نظیر ہے مگر وہ بے مثال اس لئے ہے کہ اس کے نتائج واضح، فیصلہ کن اور قطعی تھے۔ اس نے ایک طرف امام حسینؑ کے موقف کی وضاحت کر دی، ان کے مشن کو صاف طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور دوسری طرف یزید کو بے نقاب کر دیا اور اس سازش کو واضح کر دیا جو اس نے اور اس کے اعوان و انصار نے نوع انسانی کی آزادی چھیننے کے لئے کی تھی۔ یزید اور اس کے پیش رووں نے افرادِ انسانی سے جرأت اظہارِ حق و حقانیت کو سلب کرنے کی کوشش کی تھی، دین اور مذہب کے نام پر لادینی اور لامذہبیت کو رواج دینا چاہا تھا۔ جنگ کربلا کا مقصد یزید یا امثال یزید کا فنا کرنا نہ تھا بلکہ یزیدیت اور مقصد یزید کو تہس نہس کرنا تھا۔ جس کو ہم دورانِ گفتگو میں واضح کریں گے۔

فرات و دجلہ سے سیراب ہونے والی سرزمین بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں کسی زمانہ میں کلدانیہ، بابلی اور اشوریہ کی تہذیب و ثقافت قائم رہ چکی تھی۔ یہاں دنیا کا سب سے قدیم تحریری آئین تحریر کیا گیا تھا۔ یہاں بابل کا مشہور منارہ سربلند رہ چکا تھا۔ یہاں نینوا کی قدیم عظمت کے کھنڈر موجود تھے۔ یہاں کی سرزمین نے خلیلِ خدا ''ابراہیمؑ'' اور ذبیح خدا ''اسمٰعیلؑ'' کے قدم چومے تھے اور کفر و شرک کی گھنگھور گھٹا میں سراجِ توحید کی روشنی دیکھی تھی۔ اس وادی میں خدا پرست خلیل نے شاہی بُت کدہ کو ویران کیا تھا اور آتش نمرود کو گلزار بنایا تھا اور یہی زمین تھی جس پر حسینؑ باطل کو للکار رہے تھے۔ ان کے بہادرانہ تیور اور مصلحانہ انداز بتا رہے تھے کہ یزید لات و منات و ہبل کا پجاری، نمرود و فرعون و شداد اور ابولہب و ابوجہل کا جانشین ہے اور حسینؑ الوہی پرچم کے علمبردار، ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰؑ کے وارث اور اپنے نانا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کے داعی و محافظ ہیں— بھوک اور پیاس کے عالم میں جب میدانِ کارزار گرم تھا، تیر زَن زَن اِدھر سے اُدھر گزر رہے تھے، تلواروں کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ گھوڑوں کا ہنہنانا اور اونٹوں کا بلبلانا گرج کا سماں پیش کر رہا تھا، سروں کی بارش ہو رہی تھی اور خون کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا۔ قلب و جگر کے ٹکڑے، وفادار

ساتھی اور قدرشناس دوست خاک وخون میں لوٹ رہے تھے۔مگر نہ قلب میں آتشِ انتقام بھڑکی اور نہ لب پر حرفِ شکایت آیا— جوان بیٹے کی لاش نظر آئی تو شکر کا سجدہ ادا کیا۔ چہیتے بھتیجے کی میت اُٹھائی مگر تیوریوں پر بل نظر نہیں آئے۔ برابر کے بھائی کو دم توڑتے دیکھا لیکن صبر وضبط کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ چھ مہینے کا بچہ تیرِ ظُلم اپنے گلے پر لے کر جنت کو سدھارا اور آپ ''رِضًا بِقَضَائِهٖ وَتَسلِيماً لِاَمرِهٖ'' کا مجسمہ بنے رہے اور جب قاتل کا خنجر خشک گلے پر چلنے لگا تو امت کی نجات کی دعا اور اللہ کی عظمت وکبریائی کے اقرار کے سوا زبان پر کوئی ذکر نہ تھا۔اب ذرا کوفہ کی دَل بادَل فوج کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھئے۔ وہ ناحق شناس، احسان فراموش، سنگدل اور جفا پیشہ سپاہی کسی اُصول وآئین کے تحت نہیں بلکہ شاہی وظیفہ اور سرکاری انعام واکرام کی لالچ میں نبیؐ کے نواسے اور حامی حقوقِ نوعِ انسانی کا خون بہانے پر تُلے ہوئے تھے۔ دونوں فریق کے اعمال وافعال، ارادوں اورعزائم کا جائزہ لینے گئے یہ واضح طور پر معلوم ہورہا تھا کہ ایک طرف نور ہے اور دوسری طرف ظلمت، ایک طرف حق ہے دوسری طرف باطل ایک حق وحقانیت پر جان دینے والا اور دوسرا باطل وضلالت پر مر مٹنے والا۔

امام حسین علیہ السلام غیظ وغضب سے مغلوب اورغم وغصہ کی وجہ سے بے قابو ہوکر اقدامات نہیں کررہے تھے۔ ان کے سامنے ایک مرتب لائحۂ عمل اور پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ وہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے اٹھے تھے اور اللہ کے بتائے اور رسولؐ اللہ کے آزمائے ہوئے اس کارگر نسخہ پر عمل کرکے فتح حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو بڑے بڑے لشکروں پر غلبہ حاصل کرنے کی توفیق مل جاتی ہے— حسینؑ کی قائدانہ صلاحیت اور الٰہی سیاست کا کمال یہ تھا کہ پوری جنگ مُدافعانہ اُصول پر لڑی۔حملہ میں کبھی پہل نہیں کی۔ بھاگتے کا تعاقب نہیں کیا اور حملہ آوروں کو حتی الامکان ان کے ناپاک عزائم سے باز رکھنے کی تلقین فرمائی۔ آپ کی سیرت اور کردار صاف طور سے اسلام کے نام پر عام جنگوں اور جہاد اسلامی کے درمیان حدفاصل قائم کرتا ہے۔عام طور پر جنگ، یہ ایک حریصانہ عمل یا انتقامی اقدام کا نام رکھ لیا گیا ہے جس میں حریف پر غلبہ پانے کے لئے جائز وناجائز کسی حرکت سے دریغ نہیں کیا جاتا ہے۔اور جہاد اسلامی، یہ ایک عبادت ہے جس میں رضائے الٰہی حاصل کرنے اور اعلائے کلمۂ حق کا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ بات کی پیچ، خواہ مخواہ کی تباہی، توسیع مملکت اور تحصیل مال اس کی غرض نہیں ہوتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کی طرح جہاد بھی لِوَجہِ اللّٰہ ہوتا ہے اس کے بھی آداب وقواعد وشرائط، ارکان اور واجبات ہوتے ہیں۔ یہ امام عدل کی قیادت میں، حق کی حفاظت وحمایت کے لئے ادا کیا جاتا ہے۔تلوار لے کر لڑنا مردوں کے لئے ہے اور گھر کے محاذ کی حفاظت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام عورتیں بھی کرسکتی ہیں۔ پرانے زمانے میں جنگیں زر، زمین اور زن کے لئے لڑی جاتی تھیں اور آج نسل انسانی اُسی محور پر گردش کرتی نظر آتی ہے، شاطر موقع پرست اور چالاک لوگ اپنے اقتدار کی خاطر گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو لڑا

دیا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کاش مسلمان کی آنکھ کھل جائے اور مصلح ومفسد میں تمیز کرنے لگے۔ بے چارے عوام جذباتی ہوتے ہیں، ہمارے اقتدار دوست اسلامی قائدین بھولے بھالے عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج کل کے فرقہ وارانہ فسادات میں خواہ شیعہ سنّی فسادات ہوں یا ہندو مسلم نزاعیں یا کوئی اور باہمی جھگڑا، استعماری غیر ملکی ہاتھ کے علاوہ ریاست کی خواہش، اقتدار کی چاہت اور رہ نمائی اور لیڈر شپ کی للک کارفرما ضرور ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگلے زمانے میں موقع پرست افراد اپنی قیادت وریاست کی خاطر قوموں کو لڑوا کر ملکوں پر قبضہ کر کے وہاں کی آبادی کو اتنا بے دست وپا بنا دیا کرتے تھے کہ ظلم وجور سہنے والی مخلوقِ خدا احتجاج بھی نہیں کرسکتی تھی۔ سرکش اور بغاوت خو لوگوں کو رشوت کی خواب آور گولیاں دے دیتے تھے اور محنت کش ناداروں کو جبر وتشدد کے شکنجوں میں جکڑے رہتے تھے۔ حقوق انسانی کا شعور ابھی بیدار نہیں ہوا تھا اور رعایا کے اندر راعی کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ قہرمانِ دمشق نے جب اسلام کے عطا کردہ حقوق انسانی کو پامال کرنا شروع کیا اور معاشرے سے اظہار رائے اور آزادیٔ عمل کی نعمت کو چھیننا چاہا تو پروردۂ آغوش رسولؐ حسینؑ نے چاہا کہ دنیا کو اس لعنت سے نجات دلائیں۔

یہ ذکر ہے اس وقت کا جب فرانس کے انقلاب کا خواب بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اور انقلاب رُوس کا کیا ذکر روس کے نام سے بھی دنیا آشنا نہ ہوئی تھی۔ مگر امام حسینؑ نے اس گھر میں پرورش پائی تھی جہاں سے منشورِ اسلامی شائع ہوا تھا، جس نے انسانی حقوق معین اور مقرر کئے تھے۔ رسولؐ مقبول کی تعلیم وتربیت اور قرآن کی حریت ساز تبلیغ اگر آج نہ کام آئی تو کس دن کام آتی یہ سمجھنا غلط ہے کہ امام حسینؑ خواہ مخواہ مخالفت مول لینے کے عادی اور سرکشی وبغاوت پر آمادہ تھے۔ صحیفۂ کارنامۂ حسینی کے اوراق عجلت کے ساتھ نہ اُلٹئے۔ ہر صفحہ پر غور کیجئے اور آپ کی زندگی کے تدریجی حالات پر رُک رُک کر نظر ڈالئے۔ آپ کی روش شروع سے لے کر آخر تک مصالحانہ رہی ہے۔ جب بڑے بھائی امام حسن علیہ السلام نے امیر شام سے صلح کی تھی تو ایک گروہ نے آپ کو آمادہ کرنے کی سعیٔ ناکام کی تھی کہ ''آپ اس صلح کو نہ مانیے اور الگ ہو کر معاویہ پر حملہ کردیجئے۔ دیکھئے سارا عراق آپ کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں۔ ایران وخراسان کے لوگوں کو اس صلح سے بہت مایوسی ہوگی۔ یمن کے بہادر بھی اس اقدام کو پسند نہ کریں گے اور یہ تازہ دم فوجیں آپ کے علم جہاد کے سایہ میں شامیوں سے لڑنے میں کوتاہی نہیں کریں گی۔ حسینؑ مدبّر باپ کے دُور اندیش فرزند، سیاست وقت کو تاڑ گئے آپ نے فرمایا: ''ہم وہ نہیں ہیں جو عہد کر کے توڑ دیں اور صلح وصفائی کی فضا کو فتنہ وفساد کے غبار سے تاریک بنا دیں۔'' دستاویز صلح پر امیر شام نے کبھی پوری طرح عمل نہیں کیا اس لئے اہلبیتؑ کے جاں نثاروں اور علیؑ کے طرفداروں میں ہمیشہ غم وغصہ پھیلا رہا۔ جب امام حسن علیہ السلام شہید کردیئے گئے تو کوفہ کی باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا۔ بہت سے لوگ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: ''عہدنامہ کرنے والا ہی نہ رہا تو معاہدہ کی پابندی کیسی؟'' امیر معاویہ خود ہر شرط کی خلاف ورزی کرچکے ہیں

اور زہر دینے کی سازش کر کے تو وہ بالکل معاہدہ کی توہین کر چکے ہیں۔ بسم اللہ کیجئے اور معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کا اعلان فرما دیجئے۔'' حضرتؑ نے فرمایا: ''معاہدے عمل کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں، معاویہ اپنے وعدے کے پابند ہوں یا نہ ہوں، ہم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر ہم کاربند رہیں گے۔''

آخر وہ وقت بھی آیا جب موت کے فرشتہ نے امیر شام کے دروازے پر دستک دی اور ان کی روح وتن میں جدائی ہوگئی اور معاہدہ کے خلاف یزید مسند خلافت پر براجمان ہوا۔ معاویہ نے اپنی عمر کے آخری دنوں میں یزید کی خلافت کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی اور دھن، دھونس، دھاندلی اور دھینگامشتی سے اس مسند نشینی کی راہ صاف کر دی تھی۔ معاہدہ کی رو سے معاویہ کے بعد حضرت امام حسینؑ کو تنہا مسند خلافت کا حق پہنچتا تھا۔ معاہدہ کی پوری مخالفت کے بعد امام حسین علیہ السلام پر کوئی پابندی باقی نہ رہ گئی تھی۔ وہ چاہتے تو جائز طور پر اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے تھے اور اس کے حصول کے لئے فوج کشی اور قبائل عرب کو خروج کو اوپر مائل کر سکتے تھے مگر انھوں نے کوئی پیش قدمی نہیں فرمائی۔ معاہدہ کی رو سے ان کو یہ قانونی حق حاصل تھا کہ وہ حاکم مدینہ ولید کو گرفتار کر لیتے اور اپنی حکومت کا اعلان کر کے شہروں اور صوبوں میں اپنی طرف سے حاکم وگورنر مقرر فرما دیتے اور عرب قبائل سے بیعت کر لینا شروع کر دیتے۔ یہ سب کچھ کر سکتے تھے اسی سابق عہدنامہ کے تحت مگر حسینؑ یہ اس وقت کرتے جب ریاست کے طالب ہوتے، حکومت کا قیام اپنی قیادت میں مدّنظر ہوتا۔ امام حسینؑ نے یہ کچھ نہ کیا بلکہ صبر فرمایا اور صرف اس لئے کہ بات نہ بڑھے، ملک میں فتنہ وفساد برپا نہ ہو۔ آپ مصالحانہ طور پر مدینہ چھوڑ کر مکہ کی طرف نکل گئے۔ جو سارے عالم کے لئے دارالامن ہے اور جہاں بیٹھ کر آدمی نوعِ بشر کی سلامتی اور بہبودی کی تدبیریں تو سوچ سکتا ہے مگر ملک گیری اور دنیا طلبی کی ہوس میں مبتلا نہیں ہوسکتا ہے کم از کم پروردۂ آغوش تربیت رسالت حسینؑ سے تو کسی طرح یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ خانۂ خدا کو دنیوی سیاسی سازشوں کا مرکز بنائیں گے۔ اگر حکومت وقت ان سے مزاحمت نہ کرتی اور حاجیوں کے بھیس میں میں فوجی دستوں کو ان کے قتل کے لئے نہ بھیجا جاتا تو شاید وہ کبھی اس مقدس مقام سے الگ نہ ہوتے مگر خانۂ خدا کی حرمت کا آپ کو اس قدر پاس ولحاظ تھا کہ جب یہ خبر ملی کہ لوگ یہاں بھی خونریزی سے باز نہ آئیں گے تو موسم حج کے قریب مکہ سے روانہ ہوگئے۔ امام حسینؑ ہاشم وعبد مناف کے وارث عامر وعمران کے ورثہ دار اور رسول عربی وعلی بن ابی طالب کے فرزند تھے۔ ایسے لوگ موجود تھے جو آپ کو رسالت مآبؐ کے کاندھوں پر سوار اور سینہ پر آرام کرتا دیکھ چکے تھے۔ اگر آپ چاہتے تو حج کے موقع پر جب سارے عالم اسلام کے لوگ جمع تھے تو یزید کے خلاف رائے عامہ استوار کر لیتے اور عربی قبائل کو دعوتِ جہاد دے کر ایک عظیم لشکر اکٹھا کر لیتے، مگر یہ اس وقت کرتے جب حسینؑ کا مقصد حکومت کی داغ بیل ڈالنا ہوتی۔ حسینؑ کا مقصد حکومت نہیں تھا اصلاح امت تھا اسی لئے خاموشی کے ساتھ مکہ سے نکل آئے۔ جابجا قبائل عرب کے مساکن سے ہو کر گزرے ان کے چشموں اور تالابوں پر قیام بھی کیا مگر کسی قبیلہ کو اپنی حمایت کے لئے دعوت نہیں دی اور نہ بھرتی کا کوئی

دفتر کھولا اور نہ اپنے اغراض ومقاصد کی تبلیغ کے لئے سفیر بھیجے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ حسینؑ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو ذاتی مفاد اور شخصی اقتدار کی خاطر تمام دنیا کو تباہی کے غار میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ ہمارا امام مکہ سے تو نکل آیا۔ اب کسی طرف جانا تو ضرور تھا۔ یزید جیسے ظالم وجابر کی طویل وعریض حکومت میں امام حسینؑ جس طرف جاتے، موت آپ کے سر پر مسلّط رہتی، کوفہ کے علاوہ کسی مقام سے دعوت نہیں ملی تھی۔ عراق کا یہ مرکزی شہر فوج کی چھاونی تھا، ان کے والد بزرگوار اور بڑے بھائی کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ یہاں کی آبادی میں ہزاروں افراد ایسے تھے جو حضرت امام حسینؑ کے خاندان کے علمی ودینی فیوض وبرکات سے بہرہ مند ہو چکے تھے جن کو ان کی قدر ومنزلت کا اعتراف تھا اور اسی معاہدہ کے چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے تھے جو ان کے خاندان اور معاویہ کے درمیان ہوا تھا اور ان گفتگوؤں کے سننے والے تھے جو اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی تھیں۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے حضرت کوفہ نہ جاتے تو کدھر جاتے؟ امن وامان، تائید وامداد کی تھوڑی بہت جو امید ہوسکتی تھی کوفہ ہی سے ہوسکتی تھی۔ دوسرے شہروں نے تو جھوٹے منھ بھی آپ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت نہیں دی۔ مدینہ پہلے ہی چھٹ چکا تھا۔ مکہ کی حرمت برباد ہوتے دیکھنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ پھر ان دونوں شہروں کے باشندے انقلابی روح سے ناآشنا ہوتے ہوئے تقدس فروشی میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ارتشی تنظیم اور فوجی ولولے کے بجائے ان پر مجاوری کی غشی طاری تھی، وہ پرانی روایتوں اور مذہبی عقیدوں میں زیادہ مصروف نظر آتے تھے۔ زندگی کے عملی مظاہروں اور مملکت ومعاشرت کے نت نئے تقاضوں سے ان کو دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

حسینؑ حجاز سے عراق کی طرف بڑھے، کوفہ ان کی منزل مقصود تھا، عزم وارادہ یہ تھا کہ شہری آزادی کو بحال کرائیں، اسلام نے مسلم کی جو تعریف کی ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ہر فرد دوسرے کی جان ومال، عزت وآبرو اور سلامتی کا ذمہ دار ہے اسی صفت کو معاشرے میں رائج کریں۔ چاہے اس کو رواج دینے میں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے کوفہ میں میرے باپ اور بھائی نے حق آشنا اور صلح پسند لوگوں کی جو جماعت خلق کر دی تھی اس سے کام لے کر اندھیرے کو اجالے، تاریکی کو روشنی اور دورِ ظلم واستبداد کو عدل وداد گستری سے بدل دیں اور اگر کوفہ میں یہ اسلامی ماحول اور معاشی نظام قائم نہ ہوسکا تو اپنی جان کو قربان کر کے ایک ایسا منارۂ ہدایت نصب کر دوں کہ جو رہتی دنیا تک بنی آدم کو امن وآشتی کی راہ دکھاتا رہے۔ امام حسینؑ خوں ریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انسانی جان کی حُرمت اور عظمت بشر کے قائل تھے۔ دوسروں کی شمع حیات گل کر کے اپنا چراغ جلانا نہیں چاہتے تھے اور نہ اوچھے ہتھیار استعمال کر کے غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے خواہش مند تھے—— جب یہ نظر آنے لگا کہ اموی حکومت ان کو چار جانب سے گھیر کر بیعت پر مجبور کرنا یا جان لینا چاہتی ہے تو انھوں نے مردانہ وار یہ چیلنج قبول کیا اور اسلام کے شریفانہ اصول جنگ کی پابندی کر کے دنیا کو بتا دیا کہ دشمن، مخالف اور حریفِ میدانِ وغا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن پر کاربند رہنا ہر مہذّب اور شائستہ فریق جنگ کا فرض ہے حُر کے پیاسے

لشکر کو جو آپ کو گھیر کر حاکم وقت کے سامنے پیش کرنے کے لئے آیا تھا، سیراب کیا۔ عمر سعد کو جو حکومت رَے کی لالچ میں آپ کے قتل پر آمادہ تھا، نہایت نرمی سنجیدگی اور شریفانہ طریقہ پر اس حرکت سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اسے سمجھایا کہ میرے قتل کے بعد یزیدی حکومت کے خلاف جو انقلاب برپا ہوگا اس کی وجہ سے تمہاری امیدیں پوری نہ ہوسکیں گی بلکہ جان تک خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ اگر مال و دولت کی تمنا ہے تو میں اپنی جائداد تمہارے نام منتقل کئے دیتا ہوں مزے سے زندگی گزارو اور آل محمدؐ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرو۔ تاریخ کے آئینہ سے وہ غمناک منظر بھی اوجھل نہیں ہے جب زخموں سے چور ہوکر آپ زمین گرم کربلا پر خاک وخون میں غلطاں تھے۔ عمر سعد لوگوں کو آپ کا سر قلم کرنے کے لئے بھیجتا تھا اور آپ قتل کا ارادہ رکھنے والے سے فرماتے تھے: ''میں زخموں سے چور ہوں، تین روز سے بھوکا پیاسا ہوں، سیروں خون میرے جسم سے نکل چکا ہے اور دل کے ٹکڑے اور جگر پارے آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ کر دم توڑ چکے ہیں، زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکوں گا، تو کیوں اپنے نبی کے نواسے کو قتل کرکے وبال دنیا وآخرت مول لیتا ہے'' کئی آدمی یہ سن کر واپس چلے گئے مگر شمر جو بلا کا قسیُ القلب اور ظالم، انسان نما درندہ خصلت جانور تھا، آپ کی بات نہ مانی اور اس کے خنجر نے ہمارے امام کے سر وتن میں جدائی کردی۔ قاتل خود نقل کرتا ہے کہ جب تک سانس کی آمد ورفت باقی رہی۔ آپ امت کی نجات کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ لب پر شکوہ تھا اور نہ گلہ دل کی گہرائیوں سے حمد الٰہی اور بخشش اُمت کی التجا کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم امام حسینؑ کو اپنا قومی رہبر اور دینی پیشوا جانتے اور دو مہینہ آٹھ دن خصوصیت کے ساتھ ان کی یاد میں مجلسیں کرتے اور جلوس عزا نکالتے ہیں۔ اگر ان کے پاکیزہ کردار اور بلند افکار کو بھی اپنا لائحۂ عمل بنائیں تو نوع انسانی کی بڑی خدمت کرسکتے ہیں۔ آج جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں سیاسی حربوں کی بدولت نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ کے شکار ہیں۔

عشرۂ محرم رسمی طور پر نہ منایئے۔ یہ حسینی درسگاہ، اسلامی تعلیم کو از سر نو دہرانے اور زندگی کو اسی اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے جس نے بہتر جانبازوں کو کم از کم تیس ہزار کی فوج پر غالب کردیا تھا، جہاں حسینؑ کی بے مثل قیادت نے عرب وعجم، رومی اور ترکی اور حبشی نسل کے لوگوں کو نظریاتی وحدت کے ذریعہ شانہ بشانہ کھڑا کردیا تھا۔ آج بھی فرزندان اسلام پر سخت وقت آتے ہیں اور عصر حاضر کی تخریبی قوتیں ان صلاحیتوں کو چیلنج دیتی ہیں۔ کیا آزمائش کی ایسی گھڑیوں میں ہم کاروان کربلا سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں یا نہیں؟

تذکرۂ حسینی کو زندہ رکھنا اور حسینی سیاست، شجاعت اور قائدانہ صلاحیت کو مثال کے طور پر اپنی موجودہ اور آئندہ نسل کے سامنے پیش کرنا اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔

